ریل اور اِس کی استعاراتی جہتوں پر مبنی کہانیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

شاہد رضوان (پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان)

ڈاکٹر محمد خاور نوازش (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان)

Abstract:

The steam-powered train engine was introduced and experimented in 1825 in England. In subcontinent, train ran for the first time in 1853. The railway system was laid out for colonial interests in this region but it also affected the life of common man and changed the cultural norms of the subcontinent. For example Raza Ali Abidi's quote is important that ever since the start of rail, people have started marrying their daughters far and wide. Rail and its entire environment, including tracks, platforms, fort, station master, cart, signal, railway gate and passengers etc also emerged as new metaphors in the literature of this region. Almost every Urdu short-story writer has given a touch of rail and its metaphorical aspects in his stories. This article is a research and critical review of selected stories written by some prominent Urdu fiction writers in the perspective of Rail and its complete environment.

Key Words:

Rail, Raiway, Platform, Passenger, Metaphorical Dimensions, Fiction, Short Story

برِ صغیر میں صنعتی عہد اور جدید دور کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔ نہری نظام اور دھرتی کی چھاتی پر بچھائی جانے والی طویل آہنی پٹری نے ہندوستان میں ایک تہلکہ خیز تبدیلی پیدا کی۔ پٹری کے ساتھ ہی ایک نئی دنیا وجود میں آنے

لگی۔ ابتدا میں کسی دیسی کو اندازہ ہی نہ ہو گا کہ یہ بدیسی ایجاد اور کارنامہ جو بظاہر فاصلے سمٹنے کا اشارہ دے رہا تھا اُن کی زندگیوں کے پہیے کو کس رُخ اور کتنا تیزی سے گھمائے گا۔ انگلستان نے دنیا میں سب سے پہلے بھاپ پر چلنے والا انجن ایجاد کیا اور پھر اس کو پٹریوں پر مسافر اور بار برداری کے ڈبے کھینچنے کے قابل بنایا۔ اٹھارویں صدی میں برطانیہ کے ایک مزدور جمیز واٹ نے انجن ایجاد کیا اور بھاپ کی قوت دریافت کی پھر بھاپ سے چلنے والے انجن کو جارج سٹیفن سن نے ریل کی پٹری پر پہلی مرتبہ ۲۷ ستمبر ۱۸۲۵ء کو دوڑایا(۱)۔ برطانیہ کے بعد پورے یورپ، امریکہ میں ریل کی ضرورت واہمیت کو محسوس کیا گیا۔ پہلے پہل ریل کو دفاعی حوالے سے دیکھا گیا۔ اس لیے برطانیہ نے اپنے زیرنگیں برصغیر میں بھی اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پٹریاں بچھانے اور دریاؤں پر پل بنانے کا آغاز کیا۔ ہندوستان کی سرزمین پہ ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء کے دن پہلی بار ریل چلی(۲)۔ خام مال بٹورنے اور دفاعی نکتہ نظر کے باوجود ریل گاڑی نے برصغیر میں ایک نئی ثقافت کو جنم دیا۔ پرانے ذرائع آمد و رفت یعنی گھوڑا، خچر، بیل گاڑی، چھکڑا اور تانگا کی بہ نسبت ریل کا سفر تیز آرام دہ اور محفوظ سمجھا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی قافلے اور سرائے کا تصور قصہِ پارینہ ہو کر رہ گیا۔ بقول فضل الرحمان قاضی:

"ریل گاڑی کے ذکر سے ذہن میں پہیوں والے مسافر اور مال بردار ڈبوں کا تصور ابھرتا ہے جو آہنی لمبی مسلسل پٹڑی پر انجن کی قوت سے کھنچے جاتے ہیں۔"(۳)

ریل نے دو تہذیبوں کو آپس میں ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مہینوں کا سفر دنوں اور گھنٹوں میں ہونے لگا۔ لوگ دور دراز کے شہروں اور ملکوں میں رشتے ناتے جوڑنے لگے۔ اس ضمن میں رضا علی عابدی کا یہ قول بہت دہرایا گیا ہے کہ جب سے ریل گاڑی چلی ہے لوگ اپنی بیٹیوں کو دُور دُور بیاہنے لگے ہیں(۴)۔ ریل برصغیر کی تہذیب و ثقافت میں اس قدر رچ بس گئی کہ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کے ہاتھ ایک نیا موضوع لگ گیا۔ ریل سے جڑی چیزوں کے حوالے سے استعارے اور علامتیں سامنے آنے لگیں، مثلاً: پٹڑی، پلیٹ فارم، سگنل، قلی، بوگی، ڈبا وغیرہ۔ ریل سے متعلق لکھے گئے ادب کی مختلف جہتیں، علامتیں اور تناظرات ہیں۔ ارد و ادباء اس قدر ریل سے متاثر ہوئے کہ اپنی تخلیقی کتب کے نام بھی ریل سے منسوب کرنے لگے۔ شوکت تھانوی کی کتاب 'سودیشی ریل'، فردوس انور قاضی کی 'آخری ٹرین'، رضا علی عابدی کی 'ریل کہانی'، محمد حسن معراج کی 'ریل کی سیٹی'، فضل الرحمان قاضی کی 'رودادِ ریل کی'، خشونت سنگھ کی 'ٹرین ٹو پاکستان'، وقار احمد ملک کی 'ریل، رات اور ریستوران'، لیاقت علی کی 'پلیٹ فارم'، فائق احمد کی 'گاڑی جا چکی'، ، حمید قیصر کی 'سیڑھیوں والا پل'، جان ماسٹر کی 'بھوانی جنکشن'، ڈاکٹر عرفان بیگ کی 'ڈیڑھ صدی کی ریل' وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اسی طرح بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے عنوانات اور

موضوعات ریل یا اس سے جڑی چیزوں پر رکھے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کا افسانہ 'پشاور ایکسپریس'، احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'قلی'، انتظار حسین کا افسانہ 'کٹا ہوا ڈبہ' اور 'ریزرو سیٹ' حمید قیصر کا افسانہ 'سیڑھیوں والا پل' اور فائق احمد کا 'گاڑی جاچکی' وغیرہ۔ ہر چند ریل پر لکھے جانے والے ناولوں اور کہانیوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن یہاں چند منتخب کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ہندوستانی لکھاریوں کے ہاں ریل کی استعاراتی جہتیں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ریل نے موت اور خوف کو ڈھویا اور ادب کو ایک نئی پٹڑی پر ڈال دیا۔ اس سانحے نے ہمارے لکھنے والوں کو اس قدر متاثر کیا کہ کہانیوں ییں ریل بطور کردار جگہ پانے لگی۔ 'پشاور ایکسپریس' تقسیمِ ہند کے موضوع پر کرشن چندر کا بہت اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ریل بطور کردار کے نظر آتی ہے۔ چونکہ ریل نہ ہندو ہے اور نہ ہی مسلمان اس لیے اس کا کردار بہت ہی غیر جانب دار ہے۔ اس نے جس انداز میں خونی مناظر اور انسانیت سوز واقعات دیکھے، بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کر دیے۔ اس افسانے میں سپاہیوں، مسافروں، مرنے والوں، مارنے والوں اور تماش بینوں کی بے حسی اور خوف اپنی جگہ لیکن ریل گوشت پوست کے انسان کی طرح آنسو بہاتی دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے:

> "پشاور ایکسپریس زیادہ موثر افسانہ ہے، اس میں کرشن کی خطابت اپنا فنی جواز بھی پیش کرتی ہے۔" (۵)

پشاور ایکسپریس پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے اُن بدنصیب انسانوں کی المناک داستان سناتی ہے جن میں سے بیشتر اپنی منزل پر نہ پہنچ سکے۔ جنھیں جگہ جگہ اسٹیشنوں پر اتار کر بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا اور عورتوں کی عزتیں لوٹ لی گئی تھیں۔ پاکستان سے ہندو مہاجرین کو لے کر چلنے والی پشاور ایکسپریس اپنے سفر کی روداد یوں بیان کرتی ہے:

> "جب میں پشاور سے چلی، تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، یہ لوگ پشاور سے ہوتے مردان سے، کوہاٹ سے، چارسدہ سے، خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں، نوشہرہ، مانسہرہ سے آئے تھے اور پاکستان میں جان و مال کو محفوظ نہ پاکر ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر زبردست پہرہ تھا اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔" (۶)

اُس ریل کے ہر ڈبے میں دو دو سپاہی ڈیوٹی پر موجود تھے جن کے ذمے ان مہاجرین کے جان و مال کی حفاظت تھی لیکن جب باڑ ہی کھیتی کو کھانے لگے تو پھر شکوہ کس سے کیا جائے۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ

مل کر رہنے والے، ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہونے والے تقسیم کا اعلان ہوتے ہی گرگٹ کی طرح رنگ بدل گئے، جو کبھی ایک دوسرے کی عزتوں کے رکھوالے ہوتے تھے وہی ان کے درپے آزار ہو گئے۔ ٹیکسلا کے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو پلیٹ فارم پر بپھرے جہادی لوگوں نے ریل گاڑی کو نرغے میں لے لیا اور اُن کے مطالبے پر سپاہیوں نے اپنی ذمے داری 'خوب' نبھائی۔ افسانے کا ایک جملہ ملاحظہ کیجیے:

"چنانچہ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمعے کے حوالے کیے، پورے دو سو آدمی نکالے گئے ایک کم نہ ایک زیادہ۔"(۷)

نکالے جانے والے دو سو ہندو یہ سمجھے ہوں گے کہ چونکہ وہ کاروباری ہیں اور ان کے جانے سے یہاں کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور اُتارنے والے اُن کو واپس چلنے کا کہیں گے اور یہ کہ وہ یہیں رہ کر اپنا کاروبار سنبھالیں لیکن اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پھر جلد ہی انھیں پتا چل گیا کہ وہ تو کسی اور سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ مجمعے کے لوگوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر لائن میں کھڑا کیا، دو سو آدمی، دو سو زندہ لاشیں، چہرے ستے ہوئے، آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش سی محسوس کرتی ہوئیں، پہل بلوچ سپاہیوں نے کی، پندرہ آدمی فائرنگ سے گر گئے، یہ ٹیکسلا کا اسٹیشن تھا۔ بیس اور آدمی گر گئے۔"(۸)

'پشاور ایکسپریس' میں ریل کے کردار نے ٹیکسلا کی تہذیب و تمدن، یونیورسٹی اور اس معاشرے کا ذکر بھی کیا ہے جو کبھی امن کا گہوارا تھا اور جہاں کبھی اسلام کا پرچم پہلی بار بلند ہوا تھا لیکن آج اِس دھرتی پر کوئی امن کی بات کرنے والا نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر نفس دوسرے کی جان لینے کی فکر میں ہلکان ہے اور باولا ہوا جا رہا ہے۔ اُسی سرزمین پر بدھ کا نغمہ عرفان گونجا تھا۔ طرفا تماشا تو یہ کہ اس قتل و غارت گری کو جہاد کا نام دیا جا رہا تھا:

"سب مر گئے، اللہ اکبر، فرش خون سے لال تھا اور جب میں پلیٹ فارم سے گزری تو میرے پاؤں ریل کی پٹڑی سے پھسلتے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی، اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔"(۹)

ہر طرف وحشی موت کو سر سراتا دیکھ کر مجمعے کے لوگ اور سپاہی ہنستے ہوئے نہ تھکتے تھے شاید ان کے نزدیک ایک تماشا ہی تھا۔ یہ سب کچھ اس مذہب کے نام پر کیا جا رہا تھا جو ایک شخص کے ناحق خون کو پوری کائنات کے قتل کرنے کے مترادف قرار دیتا ہے۔ یقیناً کوئی الہامی مذہب بے جا قتل و غارت گری کی اجازت نہیں دیتا لیکن افسوس

کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ قتل مذاہب کے نام پر ہی ہوتے آئے ہیں۔ ریل کا کوئی مذہب نہیں ہے اس لیے وہ بطور کردار کسی بھی تعصب کے بغیر تمام مناظر جیسے دیکھے ویسے بیان کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس میں سوار ہونے والے مختلف لوگ اپنی جان بچانے کے لیے بھیس بھی بدلتے ہیں لیکن اپنے ہم وطنوں کے ظلم و بربریت سے بچ نہیں پاتے۔ کرشن چندر نے 'پشاور ایکسپریس' میں ریل کے کردار کے ذریعے ایسی منظر کشی کی ہے جو ۱۹۴۷ء کی متوازی تاریخ بھی پیش کرتی ہے۔ ایسی تاریخ جسے سرحد کے دونوں اطراف کے سرکاری یا نظریاتی مورخین بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک منظر ملاحظہ کیجیے کہ جس میں پشاور ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچی تو وہاں بھی زندہ لاشوں کو نوچنے کے لیے عقابی نظروں والے گدھ بے صبری سے منتظر تھے:

"مجھے نمبر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر ۲ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی اور اس میں مسلمان پناہ گزین بند تھے، تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمت گار میرے ڈبوں کی تلاشی لینے لگے اور زیور اور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کیے گئے، یہ مذبح کے بکرے تھے کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آ کے رکی تھی اس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تاکہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔"(۱۰)

مغل پورہ سے بلوچ سپاہی اتر گئے اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے گاڑی کی حفاظت اپنے ذمے لے لی تھی۔ پشاور ایکسپریس نے جیسے ہی ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہاں اسے پاکستان سے بھی زیادہ ہولناک مناظر دیکھنے کو ملے جسے ایک کردار کے طور پر اس نے غیر جانب داری سے بیان کیا۔ آگ ایک طرف نہیں بلکہ دونوں طرف برابر لگی تھی۔ ہر کوئی اس گھناؤنے کھیل میں مگن تھا۔ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آ گئی تھی۔ ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا اور جب میں امرتسر اسٹیشن پر پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر تھے اور ہندو جاٹ اور سکھ

اور ڈو گرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے، کوئی شکار ہے، مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔"(۱۱)

"ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا اور وہ لوگ نرغے میں لے لیے گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڈھے، جوان، عورتیں اور بچے سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا، آئی بیساکھی، آئی بیساکھی، جٹا لائے ہے ہے۔"(۱۲)

پشاور ایکسپریس قارئین کو دکھاتی ہے کہ ظلم و بربریت اور نفرت کی اس آگ میں سرحد کے دوسری طرف وہ ہندو مہاجرین بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے جنھوں نے اپنے پیاروں کو پاکستان میں کھویا تھا یا پھر اپنے ہم مذہب لوگوں کو مرتے دیکھا تھا۔ پشاور ایکسپریس جب لدھیانہ پہنچتی ہے تو وہاں اِس میں کچھ مہاجرین نیچے اتر کر پہلے اپنی نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ریل گاڑی آگے چلتی ہے۔ افسانے کا ایک اور اقتباس دیکھئے:

"لدھیانہ پہنچ کر لٹیرے گاڑی سے اتر گئے اور شہر میں جا کر انھوں نے مسلمانوں کے محلوں کا پتا ڈھونڈ نکالا اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے۔ جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی۔ جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے، میرا آگے بڑھنا دشوار کیا ناممکن تھا۔"(۱۳)

'پشاور ایکسپریس' کو ۱۹۴۷ء کے فسادات پر لکھے گئے اہم ترین افسانوں کی اُس فہرست میں رکھا جاتا ہے جہاں منٹو کے 'کھول دو' اور 'ٹھنڈا گوشت' وغیرہ موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ منظر کشی، واقعہ نگاری اور ہندوستان کی تاریخ کے ایک تلخ باب کی مجموعی تصویر پیش کرنے کے اعتبار سے یہ افسانہ متذکرہ روایت میں سب سے نمایاں ہے۔ اس افسانے میں پشاور ایکسپریس ایک خون چکاں سفر کی رُوداد بیان کرنے کے بعد جب اپنی منزل پر پہنچتی ہے تو کہانی کا اختتامیہ مزید جھنجھوڑنے والا ہے، ریل کس طرح دل برداشتہ ہے اور آگے کے بارے میں کیا سوچتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

"میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے، میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں

گی۔ میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر جاؤں گی، میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی۔"(۱۴)

۱۹۴۷ء کے فسادات کے خونی مناظر اور انسانیت سوز واقعات کو جس دردِ دل سے کرشن چندر نے ریل کی زبان سے بیان کیا ہے یہ انھی کا اختصاص ہے کہ اس موضوع پر درجنوں کہانیاں لکھی گئیں لیکن اِس انداز میں ریل کو گوشت پوست کا کردار کسی نے نہیں بنایا۔

ریل سے جڑی ہوئی کہانیوں میں سے ایک اور اہم کہانی انتظار حسین کی 'کٹا ہوا ڈبہ' ہے۔ اس افسانے پر داستانوی رنگ غالب ہے اور مکالماتی فضا قاری کو اپنے حصار میں لیے رکھتی ہے۔ منظور حسین، شجاعت علی اور مرزا صاحب افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔ اُن کے مکالمے اور کہانی سنانے کا انداز دلچسپ ہے۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ شجاعت علی اپنے باپ سے سنی کہانی سناتا ہے جو اسے ریل کے سفر کے دوران ملی تھی۔ حقہ بطور کردار کہانی میں موجود رہتا ہے۔ شر فو بھی اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ افسانے میں ریل کی پٹری بچھنے سے لے کر ریل کے چلنے تک کا بیان موجود ہے۔ افسانے کی کہانی میں جنگل میں ایک جگہ ٹرین اچانک رک جاتی ہے۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی لیکن انجن ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا۔ ایک بزرگ مسافر نے پٹری اکھاڑنے کا مشورہ دیا۔ اس کے خیال میں اس جگہ کوئی انوکھی چیز ہو سکتی ہے جس نے ٹرین کے بریک لگا دیے۔ انگریز سرکار نے پہلے تولیت و لعل سے کام لیا لیکن جب پٹری اکھاڑ ڈالی تو نیچے ایک بزرگ کو بچھی چٹائی پر بیٹھے تسبیح میں مصروف پایا، اس کے پاس چاندی کا کٹورا پڑا تھا۔ جب گاڑی دوبارہ چلی تو وہ ڈبہ کہیں پیچھے ہی کٹ کر رہ گیا جس میں مشورہ دینے والے بزرگ موجود تھے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"ڈبا، جس کی ایک کھڑکی میں سے نمایاں سب سے روشن سانولی صورت دکھائی دے رہی تھی، پاس سے گزرا اور دور ہوتا چلا گیا۔ پٹریوں میں زیادہ فاصلہ اور رفتار میں فرق زیادہ پیدا ہوا اور وہ گاڑی پیچ کھاتی ہوئی ناگن کی طرح درختوں میں گم ہوتی گئی، یہاں تک کہ آخر میں لگا ہوا مال کا بے ڈول ڈبا تھوڑی دیر دکھائی دیتا رہا، پھر وہ بھی درختوں کی ہریالی میں سٹک گیا ،اب جو جاکے دیکھتے ہیں تو چٹائی خالی پڑی تھی۔"(۱۵)

ریل کی کہانی سے جڑی ہوئے انتظار حسین کے اکثر افسانوں کا موضوع ہجرت ہے۔ کٹا ہوا ڈبہ خود انتظار حسین یا اُن کے جیسے تمام کرداروں کی علامت ہے جن کے دل و دماغ اِس نئے معرضِ وجود میں آنے والی مملکت کی

طرف ہجرت کرتے ہوئے کٹ کر اپنے آبائی وطنوں میں ہی رہ گئے۔ ٹرین نے تو اپنا سفر منزل کی طرف جاری رکھا لیکن وہ تہذیبی روایات اور قدریں جو مشورہ دینے والے بزرگوں کی طرح کہیں پٹری کے نیچے بیٹھی ٹرین کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں، وہ جب نوآبادیاتی جبر کے سامنے ماند پڑ گئیں، لوگوں کو بھی جب تقسیم کا عمل ٹرین کی حرکت کی طرح اٹل محسوس ہوا تو انھوں نے خود کو ایک کٹے ہوا ڈبے کی طرح محسوس کیا۔

انتظار حسین کا ایک اور افسانہ 'پلیٹ فارم' بھی ریل سے جڑی ہوئی کہانی ہے۔ یہ افسانہ مسافروں کی بے بسی ،ریلوے عملے کی ہٹ دھرمی اور محکمہ ریلوے کی زوال آمادگی کا نوحہ ہے لیکن یہ سب علامتیں ہیں۔ مسافروں کے درمیان ایک سوال زیر بحث ہے کہ کچھ سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا شاید وقت کے پاس بھی جواب نہیں ہوتا۔ یہ سوال بظاہر ریلوے کے بگڑتے نظام پر تنقید معلوم ہوتا ہے لیکن علامتی سطح پر یہ پورے نظام زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ ریل، ریلوے اسٹیشن، مسافر، عملہ ہمارے معاشرتی اور ملکی نظام کی علامتیں ہیں۔ اس افسانے میں ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کا جمگھٹ ہے۔ تھکن اور انتظار سے اُن کا برا حال ہے لیکن ریل کے آنے کے آثار نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ریلوے کے عملے کو بھی پتا نہیں کہ ریل کب آئے گی۔ مسافر آتے ہیں، عملے سے ٹرین کے آنے کا پوچھتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں اور تھک ہار کر پہلے سے انتظار میں پڑے مسافروں میں جگہ پا کر بیٹھ جاتے ہیں اور عملے کو کوستے ہیں۔ پلیٹ فارم پر مسافروں میں مذہبی، سیاسی ،فرقہ وارانہ، احمدی اور بہائی فرقوں کے موضوع پر گفتگو ہوتی ہے ۔ ریلوے کا عملہ بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ مسافر اُن کی ذمہ داری نہیں۔ مسافروں کو سمجھ نہیں آتی کہ آخر وہ کس کی ذمہ داری ہیں۔ رات اُتر آتی ہے مگر ٹرین نہیں آتی۔ کچھ گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور کچھ وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "ارے صاحب !اس گاڑی نے حد کر دی۔ لوگ کتنے بے آرام ہیں۔ غریب گاڑی کے انتظار میں بے گھر، بے در یہاں پڑے ہیں جیسے کوئی ۱۹۴۷ء کا خانہ برباد قافلہ پڑا ہے، بالکل وہی نقشہ ہے۔"(۱۶)

اس ایک جملے میں کہانی کار نے اپنے موضوع کو سمیٹ دیا ہے۔ یہ گاڑی دراصل آزادی کا وہ خواب ہے جس کے انتظار میں مسافر بیٹھے ہیں۔ یہ گاڑی کب آئے گی اس کا علم عملے کے لوگوں کو بھی نہیں پتا۔ بلکہ وہ خواب دیدہ مسافروں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھئی پاکستان کے پلیٹ فارم پر اتنا سکون تو ہے، کم سے کم مسافر کتاب آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ گو یا یہ ملک دراصل ایسا پلیٹ فارم ہے جسے آزادی سے اور سکون سے بیٹھ کر گاڑی کے انتظار میں کتاب پڑھنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

انتظار حسین کا ایک اور افسانہ 'ریزرو سیٹ' بھی ریل سے جڑے ہوئے استعارات پر بنی گئی ایسی کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک ہندوستانی اسطورہ کو بہ خوبی برتا ہے کہ اگر مردہ خواب میں آکر کوئی چیز دے تو عمر بڑھ جاتی ہے اگر کوئی چیز مانگے تو سمجھ لو آپ کے دن گنے جا چکے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار بو جی ہے جسے خواب میں اکثر مرے ہوئے عزیز رشتے دار ملتے ہیں، روزانہ کوئی مرا ہوا رشتے دار خواب میں آتا ہے اور ان کو کچھ دے جاتا ہے۔ وہ شوق سے سب کو خواب سناتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ فلاں مجھے فلاں چیز دے گیا۔ جس دن کوئی خواب میں نہیں آتا تو وہ پرانے خواب سنا کر گزارا کرتی ہیں۔ اسی طرح جوانی کا ایک خواب سنایا کہ خواب میں کیلا دیکھا تھا اور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ ایک رات وہ خواب میں دیکھتی ہیں کہ وہ ریل گاڑی میں سوار ہے۔ ایک سیٹ پر سیدانی بیٹھی ہیں اور ساتھ والی سیٹ خالی ہے۔ وہ بیٹھنا چاہتی ہے لیکن ریل بابو یہ کہہ کر نیچے اتار دیتا ہے کہ سیٹ خالی نہیں بلکہ کسی اور کے لیے ریزرو ہے سو وہ بعد میں آنے والی گاڑی میں سوار ہو جائے اس میں بہت جگہ ہے۔ بو جی کو لگا کہ اُس کا وقت آگیا۔ بیٹے اور پوتے ارتضیٰ کو بلا لیا، پھر خواہش کی کہ وہ مرنے سے پہلے پوتے کے سر پر سجا سہرا دیکھنا چاہتی ہے۔ پوتا مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور دہشت گردوں کی گولیاں کا نشانہ بن گیا۔ بو جی کو یاد آیا کہ ریل بابو کہہ رہا تھا کہ اماں یہ سیٹ کسی اور کے لیے ریزرو ہے اور ایک لڑکا سوار ہوا تھا۔

ریل کی استعاراتی جہتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرزا حامد بیگ نے بھی ایک اہم افسانہ 'کندیاں لائین' لکھا ہے۔ یہ افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا افسانہ ہے جس کی مبہم کہانی کا موضوع بہت کھلا ہوا نہیں ہے تاہم ذرا غور سے مطالعہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ نئی پٹری کا بچھنا ایک گزرگاہ فراہم کرنے کی علامت ہے۔ اٹک چھاؤنی سے آنے والی ریل گاڑی کے گزرنے تک مسلح گارڈز کا باہر نکل کر اپنی ریل گاڑی کے ڈبوں کے دونوں اطراف نگرانی پر کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ اس ٹرین میں کوئی غیر معمولی ساز و سامان لے جایا جا رہا ہوگا۔ ٹرین کی اصل منزل افغان سرحد ہے۔ ہمارا خطہ کئی سال تک اُس ٹرین کی گزرگاہ رہا اور اِس گزرگاہ کے راستے میں کوئی اسٹیشن اس لیے قائم نہیں کیا گیا تاکہ اس نقل و حرکت کے درمیان میں کوئی مقامی باشندہ مخل نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اطراف کی آبادی کے لیے اس التباس کا اہتمام بھی کیا گیا تھا کہ یہ ریل گاڑی پیسنجر ٹرین معلوم ہو نہ کہ مال گاڑی۔ افسانہ نگار نے کہانی کے اس بڑے موضوع کے اندر ایک پہلو یہ بھی دکھایا ہے کہ نئی پٹری بچھنے سے اطراف کی آبادیوں پر کیا نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے۔ پہلے پہل برانچ لائن بچھنے سے اُنھیں اپنی زندگیوں میں معاشی خوشحالی آنے کی اُمیدیں جاگیں۔ کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ جب جندیاں اور کوٹ ادو کے درمیان برانچ لائین کی پٹری بچھائی جانے لگی تو مقامی آبادی نے سوچا، کہ کتنا ہی اچھا ہو کہ پٹری ان کے رہائشی علاقے سے گزرے تاکہ وہ سرکار سے پیسے حاصل کر سکیں۔ جب یہ رہائشی علاقے سے نہ

گزری اور اہل کاروں کے خیمے آگے سرکنے لگے تو مقامی لوگ اپنی رہائشیں اٹھا کر پٹری کے اطراف آباد ہوتے گئے کہ اگر یہاں چھوٹا موٹا اسٹیشن بن گیا تو دکانیں کھول لیں گے۔ انھوں نے اوپر تک عرضیاں بھی گزاریں لیکن اسٹیشن بھی نہ بن سکا تھا۔ بالآخر اس پٹری پر ریل گاڑی چلنا شروع ہو گئی۔ لوگ راتوں کو جاگ کر اُس کے گزرنے کا انتظار کرتے۔ ریل کی آواز ان کے معمولات کا حصہ بن گئی، یہاں تک کہ وہ آواز سنے بغیر انھیں نیند نہ آتی۔ پھر ایک دن اچانک سرکار نے برانچ لائن بند کر دی۔ جب وہاں سے ریل گاڑی گزرنا بند ہو گئی تو لوگوں پر اُس کے نفسیاتی اثرات ایسے مرتب ہوئے کہ کئی دنوں تک انھیں نیند نہ آتی۔ افسانے کے اختتام پر اُس ٹرین کا دراصل مسافر ٹرین کے بجائے مال گاڑی ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہیں سے کہانی کا موضوع بھی کھلتا ہے۔ لوگ اُسے مسافر ٹرین سمجھ کر ہاتھ ہلاتے رہے اور اُمید لگاتے رہے کہ اُن کے علاقے میں کوئی اسٹیشن بھی بنے، سرکار کو عرضیاں بھی ڈالتے رہے، لیکن انھیں کیا علم تھا کہ ان کے علاقے سے گزاری جانے والی وہ پٹری ایک مال بردار ریل گاڑی کے لیے جو جنگی ساز و سامان افغان سرحد کے اُس پار پہنچائے گی۔ افسانے کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

> "ایک بولا: "میں بھی کہوں جب شروع شروع میں ریل کی پٹری بچھی ہے اور گاڑی چلی ہے تو ہم لوگوں نے راتوں کو جاگ کر ہاتھ ہلائے گاڑی کی طرف، پر ہمارے ہلتے ہوئے ہاتھوں کا جواب ہاتھ ہلا کر کسی نے نہ دیا۔"
>
> "جب چلتی گاڑی کی طرف ہاتھ ہلائے جا رہے ہوتے ہیں نا تو پتا چل جاتا ہے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو۔ بے شک تاریکی ہی کیوں نہ ہو۔"

اب پوری آبادی میں ایک وہی تھا، جو لگا رہا اس ٹوہ میں۔ بغیر کسی سے بات کیے چپ چاپ کھوجتا رہا۔ لیکن بس اتنا ہی جان سکا کہ اِدھر کاٹر مینس پوائنٹ اٹک چھاؤنی ہے اور اُدھر آبِ گم، کول پور، کچھ اور سپیزنڈ، جہاں سے ایک برانچ لائین ایران زاہدان کی طرف نکلتی ہے اور دوسری کوئٹہ، گلستان اور چمن کی جانب۔ اس کے آگے افغان سرحد ہے۔

"اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل مل کے دیکھا تھا کہ گاڑی کے اندر مسافروں میں سے کوئی ہنس رہا ہے تو مسلسل ہنسے جا رہا ہے۔ اُس کا منہ کھلے کا کھلا ہے۔ جو مسافر کھڑا ہے تو مسلسل ایک ہی رُخ پر کھڑا کا کھڑا ہے اور جو جھکا ہوا ہے تو مسلسل جھکا ہی ہوا ہے۔ بچے باہر کی جانب ہاتھ تو ہلا رہے ہیں پر اُن کے ہاتھ ہلتے نہیں۔

> گاڑی گزر گئی تو اُس نے سوچا، کیا گاڑی کی کھڑکیوں کے باہر کے رخ پر انسانی تصویریں چسپاں تھیں؟ گاڑی میں زندہ متحرک انسان ہی تھے یا حنوط شدہ لاشیں۔" وہ چکرا کر رہ گیا۔"(۱۷)

ریل اور اس سے متعلقات پر بُنا گیا افسانہ 'گم شدہ مسافروں کی گاڑی' احمد داؤ د نے لکھا ہے۔ یہ ایک تجریدی افسانہ ہے۔ مسافروں کو اپنی گاڑی کا انتظار ہے جو آنے کا نام ہی نہیں لیتی اور جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس کے پہنچتے ہی مسافروں کے ہجوم کی منتظر آنکھوں کو تشفی ملے گی۔ افسانے کے مختلف مناظر تجریدی رنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں اور ان مختلف مناظر کو جوڑ کر افسانہ نگار کسی ایک تاثر کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانے میں اسٹیشن بابو کو بھی نہیں پتا کہ گاڑی کب آئے گی حالانکہ اس کا اپنا بیٹا بھی اُسی گاڑی میں آ رہا ہے۔ وہ سلاخوں والے کمرے میں اسٹیشن سے دور اسٹیشن کی طرف سے آنے والی گاڑی انتظار میں ہے اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اندھیرے میں پلیٹ فارم پر نحیف بتیاں نظر آتی ہیں۔ آنے والے شہری پر اسرار شہر کے باسی ہیں اور رات کی تاریکی میں دود ھیا دھواں، کتوں کی آوازیں اور ریل کی سیٹی انتظار کی جامد فضا کا اظہار یہ ہیں۔ مرکزی کردار کا کہنا ہے کہ پہلے جب بھی کہیں ایک ہیر پیدا ہوتی تھی تو ایک وارث شاہ پیدا ہوتا تھا لیکن اب ہیر کا ریپ کر دیا جاتا ہے کیونکہ اب وارث شاہ ہیر کا دکھ بیان کرنے کے بجائے فلموں کے گیت لکھنے میں محو رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نیٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے اور باقی ہر شے سلامت رہتی ہے۔ بالآخر گاڑی آتی ہے لیکن اس میں مسافر نہیں ہوتے۔ یہ تمام ابسٹریکٹ مناظر اُسی طرح کے معاشرتی نظام پر تنقید کی علامتیں ہیں جسے انتظار حسین نے اپنے افسانے 'پلیٹ فارم' میں موضوع بنایا ہے۔ یہ ملک گویا ایسی ریل گاڑی ہے جس میں بیٹھے مسافر اپنی اصل منزل بھول چکے ہیں یا کھو چکے ہیں اور یہ ریل گاڑی بس انھیں کھینچے جا رہی ہے۔ 'گم شدہ مسافروں کی گاڑی' سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کیجیے اور اس کے تجریدی رنگ سے ابھرتا ہوا نوحہ سنیے:

> "اسٹیشن سے آوازوں کا ریوڑ اس کی جانب بڑھتا ہے، اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہے.... اندر سے سامان پھینکا جا رہا ہے۔ بکسے، حقے، جوتیاں، ڈائجسٹ، بستر بند اور پانی کی خالی صراحیاں ۔ مگر پانی پینے والے کہاں ہیں۔ پانی پینے والے کہاں ہیں۔" (۱۸)

'سیڑھیوں والا پُل' حمید قیصر کی بیانیہ انداز کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں سیڑھیوں والے پل کے نیچے سے پنڈی کی ریلوے لائن گزرتی ہے۔ پُل سے نیچے ریلوے لائن تک سیڑھیاں اترتی ہیں۔ جونہی ٹرین آتی ہے تو پُل پر رونق لگ جاتی ہے۔ جتنے لوگوں نے بھی وہاں ٹھیئے لگا رکھے ہیں انھیں ٹرین کے دیر سے آنے کا شکوہ ہے۔ حمید قیصر کی اس کہانی میں ریل اور اُس سے جڑی ہوئی ایک مکمل زندگی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ بقول ممتاز مفتی:

"یہ پل عجب لافانی حیثیت رکھتا ہے۔ حرکت اور زندگی سے بھرا ہوا۔ وہاں قسمت کا حال بتانے والے۔ طلسماتی پتھروں کی انگوٹھیاں بیچنے والے اور دست شناس اور سرمہ بیچنے والے، لاجواب چورن پیش کرنے والے بیٹھے ہیں۔"(۱۹)

افسانے کا مرکزی کردار تاری اپنی بیوی جیراں سے لڑ جھگڑ کر بغیر ناشتہ کیے طوطوں والا پنجرا اور پوٹلی اٹھائے پُل پر آتا ہے تو اس کے ہم پیشہ مانی اور سید رسول اپنے ٹھئیوں پر بیٹھے فال نکالنے میں مگن ہیں اور کارڈوں کے جملے اسے سناسنا کر چڑا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ بغیر ناشتے کے آیا ہے۔ تاری جیراں کو منحوس سمجھتا ہے کہ جب سے آئی ہے وہ دھکے کھا رہا ہے۔ سب لوگ ٹرین کا انتظار کرتے ہیں۔ جونہی ٹرین رکتی ہے تو ان کے پاس بھیڑ لگ جاتی ہے ۔ دوسے پاگل کا کردار اہم ہے جو اسے کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے، فریب ہے، دھوکا ہے لیکن اس کو اتنا یقین ہے کہ اس کی شادی تاجی سے ہو جائے گی۔ فال نکالنے والے دوسروں کو مستقبل کے سہانے خواب دکھاتے ہیں لیکن خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ فریدا حجام، شادا کیسیہیں بیچنے والا، پٹھان لڑکی چشمے بیچنے والی اور اس کا بھائی افسانے کے ذیلی کردار ہیں۔ دوپہر تک تاری کی دیہاڑی بھی لگ گئی اور اس کے چہرے کی پژمردگی جاتی رہی تھی۔ اُس نے اپنے لیے دال چاول کا آرڈر دیا اور طوطوں کے لیے کشمش بھی لے آیا تھا۔ کہانی کے انجام پر جب وہ اپنی بیوی کے لیے دنداسہ اور بچے غفار کے لیے مرلی خرید رہا تھا تو کالی بلی نے اس کے کشمیری طوطے کو اچک لیا۔ وہ بلی کے پیچھے بھاگا:

"تاری ماہر شکاری کی سی تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھر نہ جانے آناً فاناً کیا ہوا تاری کا پاؤں پھسلا اور وہ بازار کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ چار بجے والی گاڑی ایک دہشت ناک چیخ کے ساتھ پل کے نیچے سے گزر گئی۔ تاری کی چیخ گاڑی کے بے ہنگم شور کے ساتھ ہی سرد ہو گئی۔"(۲۰)

کہانی کا انجام بہت ہی دردناک ہے۔ اِدھر تاری اپنی زندگی کی بازی ہار جاتا ہے اور دوسری طرف کالی بلی ایک ٹھیلے کے نیچے بیٹھی اپنی مونچھیں چاٹ رہی ہوتی ہے۔ حمید قیصر نے ریل کی پٹڑی پر بنے ہوئے ایک پل کے منظر میں نچلے طبقے کی معاشرتی زندگی کی پوری تصویر پیش کر دی ہے۔ اُن کی خواہشیں، اُن کے معمولات اور پھر ایک طوطے کی خاطر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا جو ظاہر ہے صرف طوطا نہیں بلکہ تاری کے معاش کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔

حمید قیصر نے ریل کے استعاراتی جہتوں سے ایک اور بہت عمدہ کہانی 'رات اور ریل' بھی تخلیق کی ہے۔ یہ سادہ بیانیہ انداز کی کہانی ہے جس میں نذیر ایک باغی نوجوان ہے۔ اس کا باپ گاؤں کے چودھری کی خدمت کرتا اور بدلے میں اُسے روکھی سوکھی ملتی، نذیر نے ہوش سنبھالا تو باپ کو چودھری کی غلامی سے نکلنے کا مشورہ دینے لگا لیکن اس

کا باپ چپ ہو جاتا۔ وہ دَمے کا مریض بنتا ہے تو حویلی سے نکال دیا جاتا ہے۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی رات ہے اور نذیر گاؤں کی بے مقصد زندگی سے دور جانے کے لیے گاؤں سے سات میل دور نور پور کے اجاڑ سنسان اسٹیشن پر کھڑا ہے۔ دو پسیجنر ٹرینیں گزرتی ہیں لیکن اس اسٹیشن پر نہیں رکتیں۔ اُس نے کھانا بھی کم کھایا تھا کیونکہ اسے رات سفر کرنا اور جاگنا تھا۔ اسٹیشن پر دو چار مریل کتوں اور نورے لائین مین کے سوا کوئی نہیں۔ گاڑی آنے کا وقت ہے، نورا لائن مین اس کی مجبوری سمجھ کر سگنل اٹھا دیتا ہے گاڑی رکتی ہے اور وہ سوار ہو جاتا ہے، لائن مین لائن کلیر کرتا ہے اور لالٹین ہلا ہلا کر ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ٹرین چل دیتی ہے۔ اس منظر کا یہ ایک مکالمہ ریل کی دنیا میں لائن مین کے کردار کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

> "میں جانتا ہوں رات کو یہاں کوئی پسنجر ٹرین نہیں رکتی۔ گاؤں کا کچا اسٹیشن ریل کاروں اور پسنجر ٹرینوں کے معیار کا ہے ہی نہیں۔۔۔۔ لیکن چاچا اگر تم چاہو تو کسی ریل گاڑی کی کیا مجال جو نور پور کے بغیر گزر سکے۔؟"(۲۱)

کہانی میں اس کے بعد ٹرین کے اندر کی زندگی، ٹکٹ چیکر کا کردار، پولیس والوں کے ساتھ مسافروں کے بحث مباحثے، سوئے ہوئے مسافروں کے سامان سے اشیا چوری ہونے اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کی نفسیات سمیت بہت سے دوسرے پہلوؤں پر عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کہانی کا موضوع بھی 'سیڑھیوں والا پُل' کی طرح طبقاتی تقسیم اور بالخصوص ہمارے معاشرے کے نچلے طبقے کی زبوں حالی ہے۔

عصرِ حاضر کے معروف افسانہ نگار نیر اقبال علوی نے بھی ریل کی ماحولیات پر ایک بہت عمدہ افسانہ 'غیر مستعمل پٹڑی پر کھڑی بوگی' لکھا ہے جس میں ایک شادی شدہ مگر دھتکاری ہوئی عورت کی کہانی ہے۔ جسے بے کار بوگی کی طرح غیر مستعمل پٹڑی پر لا کر چھوڑ دیا گیا۔ عالیہ جمیل دو بچوں کی ماں ہے لیکن خوبصورت ہے۔ شادی کے بعد شوہر نے جلدی جلدی دو بچے اس کی گود میں ڈالے اور روزگار کی خاطر بیرونِ ملک چلا گیا اور وہاں کی رنگینیوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ بیوی بچوں کی طرف کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ عالیہ کی حالت اُس بوگی جیسی ہوگئی جسے گلنے سڑنے کے لیے ایسی پٹڑی پر کھڑی کر دیا جائے جس پر کبھی ٹرین آتی ہی نہیں۔ وہ مجبور ہو کر دفتر میں کام کرنے لگی اور بچوں کو سکول داخل کروا دیا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ بارش میں بھیگتی سواری کے انتظار میں تھی کہ امجد نذیر نے آکر رکشا روک دیا۔ وہ اس کا محلے دار تھا، دل میں ہزار طرح کے وسوسوں کے باوجود وہ بچوں کے ساتھ رکشے میں سوار ہوگئی، جب بچوں کو کلاس رومز میں چھوڑ کر آئی تو وہ اس کے انتظار میں باہر موجود تھا۔ رکشے والے نے اس کے اندر کے خالی پن کو ٹٹول لیا تھا۔ دو ہفتے بعد وہ پھر سواری کے انتظار میں کھڑی تھی کہ امجد نذیر نے گاڑی لا کر پاس روک دی اور انھیں بیٹھنے کو

کہا۔ دوسری ملاقات کے دوران وہ امجد نذیر کی گفتگو، ہمدردی اور محبت آمیز رویے سے ایسی متاثر ہوئی کہ اس کے ساتھ زندگی کے نئے سفر پر گامزن ہو گئی۔ ریل اور اس سے جڑے مختلف استعاروں کی مدد سے عالیہ کی زندگی کے نئے سفر کا عمدہ بیان ملاحظہ کیجیے:

"تب ایک دن انجن نے فلک شگاف سیٹی بجائی۔ ویران اور اداس سٹیشن پر پھلجھڑیاں رنگ بکھیرنے لگیں۔ ویرانہ، شادابیوں میں بدل گیا۔ چھک چھک کی آواز.... اور غیر مستعمل و بے کار بوگی سج دھج کے ساتھ زندگی کے نئے سفر کے لیے انجن سے منسلک ہو کر تیز رفتار پٹڑیوں پر دوڑنے کے لیے ہولے ہولے سرکنے لگی۔" (۲۲)

'گاڑی جا چکی' فائق احمد کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ریل جدائی کے استعارے کے طور پر نظر آتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار پلیٹ فارم پر ریل گاڑی کے انتظار میں بیٹھا ہے اور بچپن کی یادوں میں کھو جاتا ہے جب وہ اپنی چچا زاد کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے چچا کا کسی دوسرے شہر تبادلہ ہو گیا تھا۔ جب بھی ان کی روانگی کا وقت آتا تو سب ان کو الوداع کہنے اسٹیشن پر جاتے لیکن مرکزی کردار یہ لمحہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکتا۔ اس لیے ساتھ نہ جاتا لیکن جب اُن کی آمد آمد ہوتی تو سب سے پہلے اسٹیشن پر موجود ہوتا۔ وہ اک ایسی گاڑی کے انتظار میں ہے جو برسوں پہلے چھوٹ چکی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کے آنے کا منتظر ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"بنچ کے اس کونے سے لے کر دور سگنل کی سرخ بتی تک خاموشی ہی خاموشی ہے۔ میں دوپہر کے وقت جب یہاں آیا تھا تو کچھ مسافروں کی پلیٹ فارم پر گہما گہمی تھی اور اسٹیشن ماسٹر نے مجھے بتایا تھا کہ جس گاڑی میں تم ہو وہ اپنے مقررہ وقت پر نہیں پہنچ رہی۔ نجانے گاڑیوں کے آنے جانے کے مقررہ اوقات کب ٹھیک ہوں گے۔" (۲۳)

مرکزی کردار کو ٹرین کے مقررہ وقت پر نہ پہنچنے کی شکایت ہے لیکن یہ صرف اسی کہانی میں نہیں بلکہ اُردو میں لکھی گئیں ریل سے جڑی ہوئی بیشتر کہانیوں میں ریل کی تاخیر سے آمد کا نوحہ ضرور ملتا ہے۔ اس تاخیر کے ساتھ بھی پھر بہت سے موضوعات اور بہت سی نئی کہانیوں نے جنم لیا۔ اس افسانے میں ٹرین کی تاخیر مرکزی کردار کی یادوں کا دریچہ کھولتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بچپن میں اس ٹرین کے انتظار کا اپنا الگ لطف ہوتا ہے اور انتظار کی کلفتیں ٹرین سے اترنے والے محبوب کے ہونٹوں سے ابھرتی مسکان میں تحلیل ہو جایا کرتی تھیں۔ آنے والی گاڑی کا صرف اُسے ہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی انتظار ہے۔ گھر والے اُسے سودا سلف لانے کے لیے پیسے اور چٹ دیتے ہیں تو وہ خوشی سے سب چیزیں اپنے محبوب کی پسند کی لے آتا ہے اور اس پر گھر والوں کو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ بالآخر ٹیلی گراف کی

گھنٹیاں بجتی ہیں اور سگنل بھی ڈاؤن ہوتا ہے، گاڑی آتی ہے لیکن وہ گاڑی نہیں آتی جس کے انتظار میں وہ دوپہر سے پلیٹ فارم پر موجود ہے۔ یوں لگتا ہے پلیٹ فارم پر جس دوپہر وہ آیا تھا وہ اس دن کی دوپہر نہیں تھی بلکہ وہ بہت پہلے گزرے کسی دن کی دوپہر تھی لیکن شاید اس کے علم میں یہ بات نہیں۔ یہاں تک کہ اسٹیشن ماسٹر بھی اس کی پہچان میں نہیں آتا۔ سٹیشن ماسٹر بھی اُس کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہو چکا ہے۔ ایک مخصوص گاڑی کے انتظار میں اُس کی ساری زندگی بیت چکی ہے۔ جب اُس نے اپنی مخصوص گاڑی کے آنے کی بابت پوچھا تو جواب ملا:

"وہ گاڑی تو اس کی پیدائش سے پہلے چلا کرتی تھی اور ایک مرتبہ اسے حادثہ پیش آگیا جس کے بعد حکومت نے اسے بند کر دیا۔"(۲۴)

فلیش بیک میں لکھی گئی اس کہانی کے مرکزی کردار کی زندگی کا مرکز و محور ایک ریل گاڑی ہے جس کے انتظار میں اُس کی زندگی بیت چکی ہے۔ پلیٹ فارم بھی وہی ہے، سگنلز بھی وہی ہیں، اسٹیشن ماسٹر بھی وہی ہے، پٹڑی بھی وہی ہے لیکن اس پر صرف اُس کا انتظار رقصاں ہے۔ مشرف عالم ذوقی اس افسانے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"گاڑی جا چکی، ایک حسین استعارا ہے.... جو گاڑی تقسیم کے وقت انسانی لاشوں کو ڈھو رہی تھی.... تقسیم کے بعد بھی یہ گاڑی مسلسل سفر میں.... وقت ضرور بدلا لیکن مسائل وہی.... المیہ وہی.... وہی ہجرتوں کا سفر.... وہی درد کے شجر.... مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے۔"(۲۵)

اُردو افسانے کے ایک صدی سے زائد کے سفر میں ہر بڑے افسانہ نگار نے ریل اور اس کی استعاراتی جہتوں پر مبنی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور لکھی۔ بالخصوص وہ کہانیاں جو ہمارے معاشرتی نظام کو موضوع بناتی ہیں اُن میں کہیں نہ کہیں ریل گاڑی، پلیٹ فارم/ریلوے اسٹیشن، مسافر، قلی، بوگی، ڈبہ، پٹڑی، اسٹیشن ماسٹر، ٹھیلہ، سگنل، ریلوے پھاٹک وغیرہ کا ذکر براہِ راست، استعارے یا علامت کے طور پر ضرور مل جاتا ہے۔ برصغیر میں ریل کی آمد سے عام آدمی کی زندگی میں عمومی رہن سہن کی سطح پر ہی نہیں بلکہ تہذیبی روایات اور اقدار کی سطح پر اور معاشی سطح پر بھی بڑی تبدیلیاں رُونما ہوئیں اور اُردو فکشن میں زندگی کے اُس تغیر پذیر عمل کا مکمل اظہار موجود ہے۔ ریل گاڑی کے اندر کی زندگی، ریلوے حکام کے رویوں، ریل کے مسافروں کے حقیقی احساسات، ریلوے ملازمین کی زندگیوں سمیت ریل سے جڑے ہوئے ہر پہلو کی وہ تصویر جو اُردو فکشن کے بیانیے سے ابھرتی ہے وہ محکمہ ریلوے کے سرکاری ریکارڈ میں کہیں دکھائی نہیں دے گی۔ ریل سے جڑی ہوئی کہانیاں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ریل اور اُس کی ماحولیات کی پیش کش نہیں ہیں بلکہ یہ کہانیاں تو اُس سماجیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جسے کھنگالنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے.

حوالہ جات:

۱۔ فضل الرحمان قاضی، ریل کی روداد، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵

۲۔ محمد حسن معراج، ریل کی سیٹی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۴

۳۔ فضل الرحمان قاضی، ریل کی روداد، ص ۱۳

۴۔ رضا علی عابدی، ریل کہانی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸

۵۔ انوار احمد، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، کتاب نگر، ملتان، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۳

۶۔ کرشن چندر، ہم وحشی ہیں، ایشیا پبلشر، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۶

۷۔ ایضاً، ص ۶۷

۸۔ ایضاً، ص ۶۷

۹۔ ایضاً، ۶۸

۱۰۔ ایضاً، ۷۱

۱۱۔ ایضاً، ۷۱۔ ۷۲

۱۲۔ ایضاً، ۷۳

۱۳۔ ایضاً، ۷۴

۱۴۔ ایضاً، ۷۶

۱۵۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۹۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۲۸

۱۷۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، جانکی بائی کی عرضی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۱

۱۸۔ احمد داؤد، مفتوح ہوائیں، خورشید پرنٹرز، اسلام آباد، س۔ن، ص ۱۵۶

۱۹۔ ممتاز مفتی، ادب کا کھچڑا، مشمولہ: سیڑھیوں والا پُل از حمید قیصر، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸

۲۰۔ حمید قیصر، سیڑھیوں والا پُل، ص ۶۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۲۲۔ نیر اقبال علوی، می رقصم، لنک ایڈورٹائزز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۲

۲۳۔ فائق احمد، گاڑی جاچکی، آرٹ ویژن پبلشرز اینڈ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

۲۴۔ ایضاً، ۳۸

۲۵۔ مشرف عالم ذوقی، فلیپ: گاڑی جاچکی